شاعرِ مشرق

اقبال

کی نظم

مسجدِ قرطبہ

مع تشریح

سید علی رضا

شاعر مشرق

اقبال

کی نظم

مسجدِ قرطبہ

مع تشریح

سید علی رضا

انتساب

اپنی بیٹی
ڈاکٹر عذرا رضا۔ ایم ڈی
کے نام
جن کی خواہش پر
یہ کوشش کی گئی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مسجدِ قرطبہ

(ہسپانیہ کی سرزمین بالخصوص قرطبہ میں لکھی گئی)

تعارف

ہسپانیہ : یعنی ملک اسپین (Spain) جو یورپ میں جنوب ومغرب کی طرف واقع ہے۔اور شمالی افریقہ سے آبنائے جبل الطارق (Strait of Gibralter) کے ذریعے علیحدہ ہوتا ہے۔یورپ کے اور ملکوں سے علیحدہ اسپین کی یہ نرالی خصوصیت ہے کہ یہاں آٹھویں صدی عیسوی سے پندرہویں صدی عیسوی کے اختتام کے قریب تک مسلمانوں کی حکمرانی رہی جو عرب کے مشہور اُموی خاندان یعنی بنی اُمیہ (Umayyad) سے تھے۔

مسجدِ قرطبہ: یہ مسجد اسپین کے شہر قُرطبہ (Cordoba) میں جو دریائے وادی الکبیر (Guadalquivir) کے کنارے واقع ہے مسلمان حکمرانوں نے ۸۔۱۰ صدی عیسوی میں تعمیر کرائی تھی اور آج بھی اسپین میں مسلمانوں کے فنِ تعمیر کا عالیشان نمونہ مانی جاتی ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿نظم﴾

(۱) سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات
سلسلۂ روز و شب اصل حیات و ممات

سلسلہ = لغوی معنی زنجیر۔ مراد ایسے واقعات جو ایک دوسرے کے بعد رونما ہوں۔ یہاں روز و شب یعنی دن اور رات کو جو ایک دوسرے کے بعد برابر واقع ہوتے رہتے ہیں سلسلہ کہا گیا ہے۔

نقش گر = بنانے والا حادثات = نئے واقعات اصل = لغوی معنی جڑ۔ مراد کسی چیز کا وہ حصہ جس پر وہ چیز قائم ہو۔

مطلب: یہ دن و رات کا برابر ایک دوسرے کے بعد رونما ہوتے رہنا (ہمارے سامنے) نئے نئے واقعات پیش کرتا رہتا ہے۔ گویا زندگی میں دن رات نئے نئے واقعات ہوتے رہتے ہیں اور دن رات کا یہی سلسلہ زندگی اور موت کی بنیاد ہے یعنی اسی کے دوران چیزیں حیوان اور انسان وغیرہ پیدا ہوتے رہتے ہیں اور فنا ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں اشارہ معلوم ہوتا ہے

۔قرآن کریم کی اُن آیتوں کی طرف جن میں بتایا گیا کہ کائنات کی ہر شئے ایک معین مدت تک باقی رہتی ہے اور اس کے بعد فنا ہو جاتی ہے۔ مثلاً سورۂ احقاف کی آیت نمبر ۶ میں ہے

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى

(یعنی ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور ان کے درمیان والی چیزوں کو برحق اور ایک معین مدت کے لیئے خلق کیا ہے) اور ظاہر ہے کہ یہ مدّت دن اور رات کے گزرے سے ختم ہوتی رہتی ہے۔

(۲) سلسلہء روز و شب تار حریر دو رنگ
جس سے بناتی ہے ذات اپنی قباء صفات

تار = تاگا (دھاگہ) حریر = ریشم دو رنگ = جس میں دو رنگ ہوں مراد دن اور رات کی روشنی اور تاریکی۔ ذات = مراد اللہ کی ذات قبا = وہ اوپری لباس جو عرب میں پہنا جاتا تھا۔ صفات سے مراد اللہ کی صفات۔ قبائے صفات اضافتِ تشبیہی ہے۔ جس میں صفات کو قبا (یعنی لباس) سے تشبیہ دی گئی ہے۔

مطلب : دن اور رات کا سلسلہ گویا ریشم کا وہ دورنگا دھاگہ ہے جس سے اللہ نے اپنی صفات کا لباس تیار کیا ہے۔ یعنی صفات ظاہر کی ہیں۔ مفہوم یہ ہے کہ دن رات کے اس نظام

پر غور کرنے ہی سے انسان اللہ اور اللہ کی صفات کی معرفت حاصل کرسکتا اور کرتا ہے۔

(۳) سلسلۂ روزشب ساز ازل کی فغاں
جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات

ازل = ابتداء کی ہمیشگی۔ (اسی سے ازلی ہے یعنی جو ابتدا کے لحاظ سے ہمیشہ ہمیشہ سے ہو وہ صرف اللہ کی ذات ہے) سازِ ازل = یہ اضافتِ تشبیہی ہے۔ یعنی ازل کو ساز (باجے) سے تشبیہ دی گی ہے۔

سازِ ازل سے مراد اللہ فغاں = آواز زیر و بم = باجے کی آواز کا اتار چڑھاؤ یعنی نیچا اور اونچا ہونا۔ ممکنات = مراد تمام مخلوقات یا کائنات کی تمام چیزیں (اللہ کی ذات کو واجب الوجود کہا جاتا ہے اس لئے وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اور اس طرح گویا اس کا وجود ضروری یعنی واجب ہے۔ باقی کائنات کی ہر شئے اس نے خلق کی ہے۔ پس ہر خلق کی ہوئی چیز کا وجود اللہ کے خلق کرنے پر منحصر ہے۔ یعنی اگر اللہ اس کو خلق نہ کرے تو وہ وجود میں نہ آئے گی۔ اس لئے ہر مخلوق کو ممکن الوجود یا ممکن کہا جاتا ہے۔ ممکن کی جمع ممکنات ہے پس ممکنات سے مراد مخلوقات یا کائنات ہے)۔ زیر و بم ممکنات = مخلوقات کا اتار چڑھاؤ۔ یعنی وقت بہ وقت کی تبدیلیاں جیسے باجے کی آواز میں کبھی اتار اور کبھی

چڑھاؤ آتا رہتا ہے۔

مطلب : دن اور رات کا سلسلہء ازل کی آواز ہے یعنی اللہ کے ازلی ہونے کا ثبوت بہم پہنچاتا ہے اور اسی کے ذریعہ اللہ ہم کو کائنات میں وقت بہ وقت کی تبدیلیاں دکھاتا ہے۔

(۴) تجھ کو پرکھتا ہے یہ مجھ کو پرکھتا ہے یہ
سلسلہء روز و شب صیرفی کائنات

تجھ کو =شاعر مسجدِ قرطبہ سے خطاب کر رہا ہے۔ مجھ کو = مراد مسلمانوں کو پرکھتا ہے = اصلیت کو جانچتا ہے صیرفی = صرّاف جو اصلی اور نقلی سکوں اور سونے چاندی وغیرہ کو پہنچانتا ہے

مطلب : اے مسجد قرطبہ یہ زمانہ تیری حقیقت کو بھی جانتا ہے اور میری حیثیت کو بھی سمجھتا ہے ۔یعنی زمانہ بتا رہا ہے کہ تو اسپین میں مسلمان کی عظمت رفتہ کی علامت ہے اور یہ کہ ہم مسلمان سوئے ہوئے ہیں کہ اس عظمت کو پھر سے حاصل کرنے کی طرف راغب نہیں ہوتے۔

(۵) تو ہو اگر کم عیار ، میں ہو اگر کم عیار

موت ہے تیری برات،موت ہے میری برات

کم عیار = کھوٹا سکّہ برات = مراد ظاہری شان وشوکت

مطلب : اے مسجدِ قرطبہ اگر تو اصلی جوہر نہیں رکھتی بلکہ کھوٹے سکّے کی مانند ہے اور اسی طرح اگر میں بھی کھوٹے سکّے کی مانند بے اصل ہوں تو ہم دونوں کے لئے ظاہری شوکت کے بجائے موت بہتر ہے۔ مفہوم یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر تیری ظاہری شوکت مسلمانوں کے لئے حوصلہ خیز نہیں یعنی اگر مسلمانوں میں اپنی کھوئی ہوئی عظمت حاصل کرنے کا حوصلہ پیدا نہیں کرتی اور اگر ہم مسلمان ایسے ناقص اور غافل ہیں کہ اس عظمت کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے کچھ نہیں کرتے تو ہماری دونوں کی ظاہری چمک دمک کے بجائے موت آجانا بہتر ہے۔

(۶) تیرے شب روز کی اور حقیقت ہے کیا

ایک زمانے کی رو جس میں نہ دن ہے نہ رات

رو = بہاؤ۔گزران

مطلب: اے مسجدِ قرطبہ تجھ پر آج کل جو زمانہ گزر رہا ہے اس کی حقیقت صرف اتنی ہے

کہ بس دن رات اپنے چکرّوں میں رواں ہیں مگر تیرے لئے دن اور رات کا فرق بے معنی ہوگیا ہے۔ گویا تو زمانہ کی تبدیلیوں سے بے نیاز ہے (اور زبانِ حال سے اپنی اور مسلمانوں کی عظمت رفتہ کا نوحہ پڑھ رہی ہے)۔

(۷) آنی و فانی تمام معجزہ ہائے ہنر
کارِ جہاں بے ثبات ! کارِ جہاں بے اثبات !

آنی = وقتی یعنی عارضی یا بے ثبات۔ فانی = مٹ جانے والے

کار جہاں = دنیا کے کام مراد انسان کی بنائی ہوئی چیزیں۔

مطلب: (اے مسجد قرطبہ تیری عظمت رفتہ بتا رہی ہے کہ اس دنیا میں فن کے کیسے ہی اچھے شاہکار ہوں لیکن سب عارضی اور بے ثبات ہوتے ہیں۔ یہ بات بار بار کہی جا سکتی ہے کہ اس دنیا کا ہر کام فنا ہو جانے والا ہے۔

(۸) اوّل وآخر فنا باطن و ظاہر فنا
نقش کہن ہو کہ نو ، منزلِ آخر فنا

اول وآخر = قدیم زمانہ سے متعلق یا بعد کے زمانہ سے۔ باطن وظاہر = چھپی ہوئی

چیز ہو یا عیاں اور آشکارا ہو۔ یا محفوظ کی ہوئی (اور محفوظ نہ کی ہوئی چیز بھی مراد ہو سکتی ہے)

مطلب: دنیا کی تمام چیزیں خواہ قدیم زمانہ کی ہوں یا بعد کے گزرے ہوئے زمانہ کی ہوں پوشیدہ ہوں یا کھلی ہوئی۔ (بلکہ محفوظ کی ہوئی ہوں یا محفوظ نہ کی ہوئی ہوں)۔ بہر حال سب کو ایک نہ ایک دن مٹ جانا ہے۔ اسی طرح انسان کے بنائے ہوئے کام مثلاً عمارتیں وغیرہ پرانی ہوں یا جدید زمانہ کی سب فنا ہو جانے والی ہیں۔

(۹) ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

نقش = انجام دیا ہوا کام۔ ثبات دوام = ہمیشہ قائم رہنے کی خاصیت

مردِ خدا = خدا سے لو لگائے ہوئے شخص

مطلب: اب شاعر اوپر کے شعروں میں بیان کئے ہوئے اصول میں ایک استثنا پیش کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ (یوں تو دنیا میں ہر شے اور ہر کام کو فنا ہے لیکن) ایسے کام جو کسی ایسے شخص نے کئے ہوں جو خدا سے لو لگائے ہو یعنی اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے انجام دئے ہوں اس دنیا میں باقی رہ جاتے ہیں (اس دنیا میں باقی رہ جاتے ہیں کیونکہ وہ ہر آنے والی نسل کے لئے باعث حوصلہ افزائی اور نمونۂ تقلید و ہدایت ہوتے ہیں)۔

(۱۰) مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحب فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

عشق = اقبالؔ نے عشق کا لفظ نہایت پُرمعنی مفہوم میں استعمال کیا ہے مثلاً لگن، گہرا جذبہ، سچّی اور پائدار عقیدت۔ فروغ = ترقی۔رونق۔ صاحب فروغ = جس کو فروغ حاصل ہو۔

مطلب: ایسے شخص کا جو خدا سے لو لگائے ہوئے ہو ہر عمل اس کے جذبہء عشق اور خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی لگن کی بدولت کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار ہوتا ہے۔ کیونکہ لگن کے جذبہ ہی سے عمل کو ابدی زندگی ملتی ہے اور موت کبھی نہیں آتی ۔ یہاں زندگی سے مراد ظاہری موت کے بعد بھی کام کرنے والے کے کام اور نام کا باقی رہنا ہے۔

(۱۱) تُند وسبک سیر ہے گرچہ ء زمانے کی رو
عشق خود اک سیل ہے، سیل کو لیتا ہے تھام

تند وسبک سیر = تیز چال والا۔ رو = بہاؤ۔ سیل = دھارا

مطلب: اس شعر میں زمانہ کو دریا سے تشبیھ دی گئی ہے ۔ (جس طرح دریا بہتا رہتا ہے ۔اور ہر چیز کو فنا کی طرف لئے جاتا ہے۔ گو زمانہ دریا کی مانند نہایت تیز رفتار سے رواں دواں

ہے لیکن عشق یعنی سچی لگن سے کام کرنے کا جذبہ بھی ایک دھارا ہی ہے جو زمانے کے بہاؤ کو روک دیتا ہے۔ مفہوم اس سے یہ ہے کہ گو زمانہ اپنی تیز رفتار سے ہر چیز کو فنا کی طرف لئے جاتا ہے لیکن جو کام سچی لگن سے کیا جائے وہ زمانہ کی فنا خیزی سے محفوظ رہتا اور ابدی زندگی پالیتا ہے۔

(۱۴) عشق کی تقویم میں عصرِ رواں کے سوا
اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام !

تقویم = جنتری یعنی دن، مہینے اور سال وغیرہ کا حساب۔ عصرِ رواں = زمانہ جو برابر گزرتا رہتا ہے۔

مطلب: یہ زمانہ (جسے ہم جانتے ہیں) مسلسل گزرتا رہتا ہے اور اس کی جنتری گزرتے ہوئے دنوں، مہینوں، سالوں وغیرہ کے حساب سے رکھی جاتی ہے لیکن عشق یعنی سچی عقیدت لگن وغیرہ کی جنتری میں دنوں مہینوں اور سالوں وغیرہ کے علاوہ اور ہی زمانے ہیں جن کا کوئی نام نہیں ہے۔ مفہوم یہ کہ جذبہء عشق اور اسکی کارفرمائیوں کے لئے یہ گزرتے ہوئے دن مہینے اور سال وغیرہ کوئی معنی یا اہمیت نہیں رکھتے۔

(۱۳) عشق دم جبرئیل ، عشق دلِ مصطفیٰ ﷺ
عشق خدا کا رسول ، عشق خدا کا کلام !

دم = سانس مراد زندگی۔ جبرئیل = مشہور فرشتہ جو رسول خدا ﷺ کے لئے اللہ کی وحی لانے پر مامور تھے اور اسی لئے ان کو اسلامی ادب میں امین وحی اور روح الامین کہتے ہیں۔ مصطفیٰ = آنحضرت رسول خدا ﷺ کا مشہور ترین لقب جو آپ کا اسم مبارک بن گیا ہے۔

مطلب: حضرت جبرئیل کی زندگی بھی ہمہ تن عشق ہے اور آنحضرت رسولِ خدا ﷺ کی زندگی بھی سراپا عشق ہے۔یعنی دونوں ہستیوں کی زندگیاں اطاعتِ خدا کی لگن سے معمور (بھری ہوئی) ہیں۔

(۱۴) عشق کی مستی سے ہے پیکر گل تابناک
عشق ہے صہبائے خام ، عشق ہے کاس الکرام

عشق = مراد خوب سے خوبتر کی تلاش کا فطری جذبہ۔ عشق کی مستی = یہ اضافت تشبیہ ہے عشق کو شراب سے تشبیہ دی گئی ہے۔ پیکر = جسم تابناک = چمکدار صہبائے خام = شرابِ مقطر یعنی عرق کیطرح سے صاف کیا ہوا۔ کاس

= پیالہ مراد شراب پینے کا پیالہ کرام = بڑے مرتبہ والے افراد

مطلب: عشق ہی ایسے جذبہ سے پھول میں چمک اور زیبائی پیدا ہوتی ہے۔ عشق ہی سے عمدہ عمدہ شراب بنتی ہیں اور عشق ہی سے بڑے بڑے لوگوں کے لئے شراب کے پیالے تیار ہوتے ہیں۔ ظاہراً مفہوم یہ ہے کہ دنیا کی ساری چمک دمک عشق ایسے پر ولولہ جذبات ہی کی بدولت ہے کیونکہ اگر ولولہ نہ ہو تو کام انجام نہیں پا سکتا۔

(۱۵) عشق فقیہہ حرم، عشق امیرِ جنود
عشق ہے ابن سبیل، اس کے ہزاروں مقام!

فقیہ = احکام شریعت کا جاننے ولا۔ گویا عبادت کرنے ولا۔ حرم = خانہ ءکعبہ فقیہہ حرم = خانہ ءکعبہ میں عبادت کرنے ولا جنود جمع ہے جُند کی۔ معنی لشکر امیرِ جنود = لشکروں کے سردار ابن سبیل = مسافر

مطلب: خانہ ءکعبہ میں عبادت کرنے ولا عالمِ شریعت ہو یا (اسلامی) لشکروں کے سردار ہوں سب ہی جذبہ ءعشق سے سرشار ہیں۔ چناچہ عشق کی مثال ایک مسافر کی سی ہے کہ جس طرح مسافر دوران سفر متعدد منزلوں پر قیام کرتا ہے اسی طرح عشق (یعنی ولولہ ءشوق) بھی ہزار ہا شکلوں اور طریقوں سے افراد میں کارفرما رہتا ہے۔

(۱۶) عشق کے مضراب سے نغمہ ء تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات ،عشق سے نارِ حیات

مضراب = لکڑی یا دھات کا بنا ہوا آلہ جس سے وہ باجہ بجایا جاتا ہے جسمیں آواز پیدا ہونے کے لئے تار لگے ہوتے ہیں جن کو مضراب سے ضرورت بھر چوٹ لگا کر آواز پیدا کی جاتی ہے۔ تارِحیات = زندگی کا تار ۔ زندگی کوایسی تار لگے ہوئے باجے سے تشبیھ دی گئی ہے۔ نارحیات = زندگی کی چمک دمک آتی اور زندگی کی گرمی یعنی تازگی۔

مطلب = عشق ہی سے زندگی میں جان پڑتی ہے جس طرح باجے کے تار میں مضراب سے چوٹ لگانے سے نغمہ پیدا ہوتا ہے۔عشق ہی سے زندگی میں چمک دمک آتی اورزندگی کی گرمی یعنی تازگی قائم رہتی ہے۔

(۱۷) اے حرمِ قرطبہ ! عشق سے تیرا وجود
عشق سراپا دوام جس میں نہیں رفت و بود

حرم = محترم مقام ۔مرادمسجد دوام = ہیشگی

مطلب: اے قرطبہ کی قابل تعظیم مسجد تو عشق کی بدولت وجود میں آئی ہے اورعشق ایسا جذبہ ہے جس کوفنا نہیں (کیونکہ یہ انسان کی فطرت میں داخل ہے)اوراس کو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ

تھا اور چلا گیا۔ مفہوم اس کا یہ ہے چونکہ یہ مسجد ایسے شخص نے بنائی ہے جسے اللہ سے عشق تھا اور عشق دوامی جذبہ ہے اس لئے یہ مسجد بھی اسی عشق کی دائمی یعنی باقی رہنے والی یادگار ہے

(۱۸) رنگ ہو یا خشت و سنگ، چنگ ہو یا حرف وصوت
معجزہء فن کی ہے خونِ جگر سے نمود !

رنگ = مراد مصوری، خشت و سنگ = اینٹ پتھر۔ مرادفنِ تعمیر کے شاہکار، چنگ = ایک قسم کا باجا۔ مراد آلات کی موسیقی، حرف وصوت = بولی اور آواز ۔ مراد گلوکاری یعنی گانا۔ خون جگر = مراد گہری عقیدت۔لگن نمود = اظہار مراد وجود میں آنا۔ پیدا ہونا

مطلب: مُصوری ہو، فن تعمیر ہو، موسیقی ہو ہو یا گلوکاری، ہر فن کا کمال خون جگر صرف کرنے یعنی سچی عقیدت اور لگن سے پیدا ہوتا ہے۔

(۱۹) قطرۂ خون جگر، سل کو بناتا ہے دل
خون جگر سے صدا سوز و سرور و سرور !

قطرۂ خون جگر = مراد عقیدت۔لگاؤ۔ سل = پتھر کا ٹکڑا جس پر چیزیں

پسیں جاتی ہیں۔ یہاں مراد پتھر کے مانند سخت دل۔ دل = مراد دل کے مانند نرم و نازک مانا جاتا ہے۔اور سختی اور ظلم کرنے والے کو سخت دل یا سنگدل کہتے ہیں اردو کے مشہور قدیم شاعر میر انیس نے دل کی نرمی و نزاکت کو کیسے حسین انداز سے بیان کیا ہے کہتے ہیں:

انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو کہ ٹوٹنے میں یہ شیشے صدا نہیں رکھتے

سوز = دل کو نرم کرنے والا احساسِ درد وغم۔

مطلب: سچی محبت عقیدت اور لگاؤ کے ذریعہ پتھر ایسے سخت دل والے شخص کو نرم دل بتایا جا سکتا ہے اور اسی طرح عقیدت ہی سے آواز دردانگیز، دل خوش کن یا سُریلی ہوتی رہتی ہے

(۲۰) تیری فضا دل فروز ، میری نوا سینہ سوز
تجھ سے دلوں کا حضور ، مجھ سے دلوں کی کشود

فضا = ماحول مراد مقام۔ دل فروز = دل کو روشنی بخشنے والی۔ نوا = آواز سینہ سوز = سینہ کو جلانے والی یعنی غمناک۔ حضور = مراد خدا کے سامنے حاضر ہونے کا سا احساس۔ دل کی کشود = دل کا خوش ہونا۔

مطلب: اے مسجد قرطبہ تیرا، مقام دیکھنے سے دل خوش ہو جاتا ہے۔میری آواز (جس سے میں مسلمانوں کو انکی عظمت رفتہ یاد دلاتا ہوں) دلوں کو غم زدہ کر دیتی ہے۔تجھ سے حضورِ قلب

حاصل ہوتا ہے یعنی تجھ کو دیکھ کر خدا کے سامنے حاضر ہونے کا احساس ہوتا ہے۔اور میری بدولت دل کھل جاتے ہیں۔

(۲۱) عرشِ معلّٰی سے کم سینہء آدم نہیں
گر چہ کفِ خاک کی حد ہے سپہر کبود

عرشِ معلّٰی = اللہ کا عرش جو بلند ترین مقام کی علامت ہے۔ کفِ خاک = مراد زمین ۔ سپہر کبود = نیلا آسمان۔

مطلب : گو زمین کی حد نیلے آسمان تک ہے لیکن (اس پر بسنے والے انسان کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کا سینہ مرتبہ عرشِ الٰہی سے کم نہیں۔(کیونکہ وہ معرفت الٰہی کا حامل ہوتا ہے اور ایسے پسندیدہ جذبات بھی رکھتا ہے جیسے عشق۔محبت۔باہمی ہمدردی۔ایثار۔قربانی وغیرہ جن سے فرشتے تک محروم ہیں)۔

(۲۲) پیکرِ نوری کو ہے سجدہ میّسر تو کیا
اس کو میسر نہیں سوز و گداز سجود!

پیکرِ نوری = فرشتہ سجود=سجدہ کی جمع بھی ہے اور اسم مصدر بھی۔

مطلب: فرشتہ کو یہ موقع ضرور حاصل ہے کہ وہ ہمہ وقت اللہ کو سجدے کرتا رہتا ہے لیکن یہ بڑی بات نہیں کیونکہ فرشتے جذباتِ سے عاری اور درد وغم کے احساس سے محروم ہیں جبکہ انسان کو یہ شرف حاصل ہے کہ اس کا دل درد وغم سے آشنا ہے جو سجدہ کی روح ہے۔

(۲۳) کافرِ ہندی ہوں میں دیکھ مرا ذوق و شوق
دل میں صلوٰۃ و درود، لب پہ صلوٰۃ و درود

کافر = مراد عاشق۔ عقید تمند۔ فارسی اور اردو شاعری میں عاشق کو کافر، عشق کو کفر اور معشوق کو صنم (یعنی بت) کیا جاتا ہے۔ اردو کے مشہور شاعر بیخود موہانی (جو لکھنوء سے چند میل کے فاصلہ پر ایک قدیم قصبہ ہے) کا ایک شعر ہے:

مرتے مرتے بھی کہا یہ مرے کافر دل نے
آج کی اور سہی کل سے مسلماں ہونگے

اس شعر میں کافر دل سے مراد عاشق دل اور مسلمان ہونے سے مراد ترکِ عشق ہے

ہندی = ہندوستان کا باشندہ۔ یہاں یہ لحاظ رہے کہ قیام پاکستان سے پہلے علاقہ بھی جواب پاکستان ہے ہندوستان میں شامل تھا اور ہندوستان ہی کہلاتا تھ۔ اس لئے شاعر یعنی اقبالؔ

نے اپنے کو ہندی (یعنی ہندوستانی) کہا ہے حالانکہ وہ اس علاقہ کے باشندہ تھے جواب پاکستان ہے۔علاوہ بریں سابق ہندوستان میں (اور موجودہ ہندوستان میں بھی) غیر مسلموں (یعنی کافروں) کی اکثریت ہے چناچہ وہاں مسلماں کا ہونا ایک لحاظ سے خصوصیت ہے لہذا ہوسکتا ہے کہ شاعر نے اسی خصوصیت کے مدنظر اپنے لئے کافر ہندی کا مرکّب استعمال کیا ہے۔

مطلب: میں ہندوستان ایسے کافر آبادی والے ملک کا باشندہ ہوں لیکن میرا عقیدہ قابل تحسین وآفرین ہے کہ میں دل سے بھی اور زبان سے بھی رسولِ اللہ ﷺ پر درود وسلام بھیجتا رہتا ہوں یعنی سچا مسلمان ہوں۔

(۲۴) شوق مری لے میں ہے، شوق مری نَے میں ہے
نغمہء اللہ ہو میرے رگ و پے میں ہے

شوق = عشق الٰہی لَے = لوچدار آواز نَے = بانسری۔ حلق کو بھی کہتے ہیں
نغمہء اللہ ہو = (اللہ ہو) کو یاد کرنے یا دعا کے لئے پکارنے کا مسلمانوں کا عام نعرہ۔ رگ و پے میں ہے = تمام جسم میں ہے

مطلب: میری آواز میں بھی اور میری بانسری میں بھی اللہ کی محبت بھری ہوئی ہے۔اور اللہ کو یاد

کرنے اور پکارنے کا فقرہ ''اللہ ہو'' میرے سارے جسم میں بھرا ہوا ہے۔

(۲۵) تیرا جلال و جمال ، مردِ خدا کی دلیل
وہ بھی جلیل و جمیل ،تو بھی جلیل و جمیل

جلال = عظمت۔ جمال = خوبصورتی دلیل = ثبوت

مطلب: (اے مسجدِ قُرطبہ) تیری عظمت اور خوبصورتی اس امر کا ثبوت ہے کہ تیرا بنانے والا خدارسیدہ آدمی تھا اور چونکہ اللہ عظیم و خوبصورت ہے اس لئے تو بھی عظیم و خوشنما ہے۔

(۲۶) تیری بنا پائیدار، تیرے ستوں بے شمار
شام کے صحرا میں ہو جیسے ہجومِ نخیل!

بنا = بنیاد پائدار = مضبوط۔ ستون = کھمبا۔ شام = ملکِ شام (انگریزی میں Syria۔ صحرا = جنگل یا میدان ہجوم = جمگھٹا یا جھنڈ۔ (گویا باغ)۔ نخیل = کھجور کے درخت۔

مطلب: (اے مسجدِ قرطبہ) تیری بُنیاد مضبوط بنی ہوئی ہے۔ تیری تعمیر میں اَن گنت کھمبے ہیں ۔جیسے ملک شام کے میدانوں میں کھجور کے سیدھے سیدھے درخت ہوتے ہیں۔

(۲۷) تیرے درد بام پر وادیٔ ایمن کا نور
تیرا منارِ بلند جلوہ گہ جبرئیل

دردوبام = دروازے اور چھتیں۔ وادی ایمن = لغوی معنی مبارک وادی۔ مراد وہ وادی جس میں حضرت موسیٰ پیغمبر کو جلوہ الٰہی نظر آیا تھا۔ جبرئیل = وہ مشہور فرشتہ جن کو مرتبہ میں تمام فرشتوں سے افضل مانا جاتا ہے۔ جلوہ گاہ جبرئیل = ایسا منور مقام گویا کہ جبرئیل کی اقامت گاہ ہے۔

مطلب: (اے مسجد قرطبہ) تیرے دروازوں اور چھتوں پر (گویا پوری عمارت پر) اللہ کا وہی نور چمک رہا ہے جو وادیٔ ایمن میں حضرت موسیٰ پیغمبر کے لئے چمکا تھا۔ اور تیرا مینار ایسا بُلند ہے گویا وہ حضرت جبرئیل (ایسے بلند مرتبہ فرشتہ) کی اقامت گاہ ہے۔

(۲۸) مٹ نہیں سکتا کبھی مرد مسلماں کہ ہے
اسکی اذانوں سے فاش سرِّ کلیمؑ و خلیلؑ

مرد مسلماں = مراد مسلمان قوم۔ فاش = آشکار، عیاں، سرّ = بھید، راز
کلیم = حضرت موسیٰ پیغمبر کا لقب۔ خلیل = حضرت ابراہیم پیغمبر کا لقب۔ سرّ کلیمؑ و خلیلؑ = اللہ کے وجود وحدت کا پیغام جو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ نے دنیا کو پہنچایا

یعنی اسلام کیونکہ وہی اسلام کا پیغام ہے۔
مطلب: مسلمان قوم کبھی مٹ نہیں سکتی کیونکہ مسلمانوں کی مسجدوں سے اسی پیغام کا اعلان ہوتا رہتا ہے جو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰ نے پہونچایا تھا۔ (گویا اسلام کا پیغام نشر ہوتا رہتا ہے)۔

(۲۹) اس کی زمیں بے حدود، اس کا افق بے ثغور
اس کے سمندر کی موج ، دجلہ و ڈینوب و نیل !

حدود = حد کی جمع۔ ثغور = ثغر کی جمع۔ معنی کسی ملک کی سرحد دجلہ = عراق کا مشہور دریا (انگریزی میں Tigris)۔ ڈینوب = وسطی یورپ کا دریا جو کئی ملکوں سے گزرتا ہے۔ نیل = سوڈان و مصر کا مشہور دریا۔ دجلہ و ڈینوب و نیل سے مراد تمام دنیا کے دریا۔ یہ چند نام بطور مثال بیان ہوئے ہیں۔
نوٹ نمبر 1 : اس شعر میں اس، کا اسم اشارہ یوں تو لفظ مسلمان کے لئے استعمال ہوا ہے لیکن مراد اس سے اسلام ہے۔ نوٹ نمبر 2: اسی طرح ''سمندر کی موج'' اضافت تشبیہی ہے جس میں اسلام کو سمندر سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ سمندر کی موجیں (یعنی اس کا پانی) دور دور تک ہے اس لئے سمندر کی موج سے مراد اسلام کی وسعت۔

مطلب: اسلام کی زمین بے حدود ہے اور اس کے افق بے کنارہ ہیں۔ اسکی وسعت دنیا کے تمام روُدریاؤں پر پھیلی ہوئی ہے۔ گویا یوں کہا جاسکتا ہے کہ زمین کے لحاظ سے اسلام بے حدود ہے اور سمندر کے لحاظ سے دنیا کے تمام آبی حصوں پر حاوی یعنی پھیلا ہوا ہے۔ شاعر نے اسلام کو بے حدود سرحد اور تمام دنیا پر حاوی اس لئے کہا ہے کہ اسلام کا تعلق کسی سرزمین کے بجائے انسان کے عقیدہ سے ہے۔ پس جہاں بھی انسان اسلام کے عقیدے قبول کرلیں وہیں ملکی سرحدوں کے امتیاز کے بغیر اسلام کہلائے گا۔

(۳۰) اس کے زمانے عجیب، اس کے فسانے غریب
عہد کہن کو دیا اس نے پیامِ رحیل!

زمانے = تاریخی کارنامے عجیب = حیرت خیز۔ غریب = نرالے
عہد کہن = قدیم زمانہ۔ مراد پرانے رسم ورواج۔ پیامِ رحیل = کوچ کرنے یعنی چلے جانے کا حکم مراد مٹا ڈالنا۔

مطلب : اسلام کے تاریخی کارنامے حیرت میں ڈالنے والے اور اس کے واقعات نرالے ہیں۔ اس نے پرانے زمانہ کے رسم رواج مٹا کر رکھ دیئے۔

(۳۱) ساقی اربابِ ذوق ، فارسِ میدان ، شوق
بادہ ہے اس کا رحیق، تیغ ہے اس کی اصیل!

ساقی = پلانے والا مراد مطمئن کرنے والا۔ ارباب ذوق = صحیح ذوق رکھنے والے فارس = شہسوار شوق = مراد ترقی کرتے رہنے کا جذبہ۔ فارسِ میدان شوق = اس میں اضافت تشبیہی ہے۔ ترقی کا جذبہ رکھنے والوں کو میدانِ جنگ کے شہسواروں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ بادہ = (شراب پینے کا) پیالہ۔ رحیق = عمدہ شراب اصیل = اصلی یعنی اعلیٰ قسم کی۔

مطلب: (اسلام بلند ذوق رکھنے والوں کو اپنے اصول اور طریقوں سے) مطمئن کرنے والا ہے۔ میدان ترقی کا شہسوار ہے اس کی شراب اعلیٰ اور اسکی تیغ اصلی ہے۔ گویا ساقی کی حیثیت سے اسکا پیالہ اچھی شراب سے بھرا ہوا ہے اور شہسوار کی حیثیت سے اسکی تلوار تیز ہے۔

(۳۲) مردِ سپاہی ہے وہ اس کی زرہ لاالٰہ
سایۂ شمشیر میں اس کی پناہ لاالٰہ

زرہ = تلوار وغیرہ کی کاٹ سے بچانے والا لباس (جو عام طور سے لوہے کی کڑیوں یا حلقوں کا بنا ہوا ہوتا ہے)۔

مطلب: اسلام کی مثال بہادر سپاہی کی سی ہے۔ اس کی زرہ لاالٰہ یعنی کلمۂ اسلام پر ایمان و

اعتماد ہے اور جب مقابلہ دشمن کی شمشیروں سے ہو رہا ہو تو اس کو بچانے والا یہی کلمہ ء لا اِلٰہ ہے۔

(۳۳) تجھ سے ہوا آشکار بندۂ مومن کا راز
اس کے دنوں کی تپش ،اس کی شبوں کا گداز

دنوں کی تپش = دن میں کی جانے والی محنت (خوہ وہ جہاد و جنگ کی ہو یا کسب معاش کے لئے یا کسی اور جائز مقصد کے لئے ہو)۔ شبوں کی گداز = رات میں کی جانے والی عبادتیں جب دل نرم ہو کر اللہ کی طرف مائل رہتے ہیں۔

مطلب: (اے مسجدِ قرطبہ) تجھ سے مومن کی زندگی کا طریقہ معلوم ہو گیا۔ وہ یہ کہ سچا مومن دن میں کسب معاش وغیرہ کی محنت ۔مشقت میں مصروف رہتا ہے اور راتیں اللہ کی عبادت میں گزارتا ہے اس طرح کہ اس کا دل نرم ہو کر اللہ کے سامنے جھک جاتا ہے۔

(۳۴) اس کا مقامِ بلند ،اس کا خیالِ عظیم
اس کا سرور اس کا شوق ،اس کا نیاز ،اس کا ناز

یہ شعر پیشرو شعر سے مربوط ہے یہ کہ مسجد ہی کے ذریعے مومن کا بلند مرتبہ ۔اس کے عظیم

ارادے۔اس کی خوشی۔اس کا شوق وولولہ۔اسکی ادائے بندگی اوراس کا احساس برتری وغیرہ یہ سب خواص معلوم ہوجاتے ہیں۔

(۳۵) ہاتھ ہے اللہ کا ،بندہء مومن کاہاتھ
غالب و کار آفریں ،کار کشا، کارساز

غالب = اپنے مقابل پر فتح حاصل کرنے والا۔ کارآفریں =کام انجام دینے والا۔
کارکشا=(مشکل) کام کا حل کرنے والا۔ کارساز=کام بنانے والا۔

مطلب: سچے مومن کا ہاتھ گویا اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے۔وہ اپنی قوت ایمانی سے مشکل سے مشکل کام کرڈالتا اور ہر دشواری کوسَر کرلیتا ہے۔

(۳۶) خاکی ونوری نہاد، بندۂ مولا صفات
ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بے نیاز

خاکی نوری نہاد=آدمی اورفرشتہ دونوں کی صفتوں کا حامل۔ مولاصفات = اللہ کی جیسی صفات رکھنے والا۔

مطلب: اس شعر میں بھی مومن کی صفات بیان ہورہی ہیں۔یعنی مومن ہےتو خاکی کہ مٹی

سے بنا ہے اور زمین پر رہتا ہے لیکن اس میں صفات نوری یعنی فرشتوں کی سی ہیں گویا آدمی اور فرشتہ دونوں کی خاصیتیں رکھتا ہے (مثلاً آدمی کے جذبات محبت و ہمدردی وقربانی وایثار وغیرہ اور فرشتوں کی سی اطاعت الٰہی و پاکبازی وغیرہ)۔ اور وہ دنیا وآخرت دونوں کی طرف سے سیر چشم رہتا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ اس کے اعمال نہ دنیا کے لالچ میں ہوتے نہ آخرت میں کے خوف سے بلکہ وہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ہمہ تن اس کی اطاعت میں مصروف رہتا ہے۔

(۳۷) اس کی امیدیں قلیل، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دل فریب، اس کی نگہ دل نواز

قلیل = کم، تھوڑا۔ جلیل = بلند، عظیم۔ دل فریب = دل کو بھانے والی۔
دل نواز = دل کو خوش کرنے والی۔

مطلب: مومن کی خواہشیں کم ہوتی ہیں۔ ارادے بلند ہوتے ہیں۔ اسکے برتاؤ کے طریقے دل پسند اور اس کی نظریں خوش کُن ہوتی ہیں۔

(۳۸) نرم دمِ گفتگو، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز

دمِ گفتگو = بات چیت کے دوران۔ جستجو = کوشش۔ رزم = جنگ، مقابلہ بزم = محفل گفتگو۔ مراد حالت صلح (یعنی رزم کی ضد)۔ پاک دل = نیت اور جذبات کا پاک۔
پاکباز = عمل کا پاک۔

مطلب: مومن بات چیت کے دوران نرم رویہ رکھتا ہے۔ البتہ کسی کام میں مصروف ہوتا ہے تو اس کو سرگرمی سے انجام دیتا ہے۔ خواہ جنگ میں ہو یا کسی محفل میں ہر حال میں اسکی نیت بھی پاک ہوتی ہے اور عمل بھی صاف ستھرا ہوتا ہے۔

(۳۹) نقطہء پرکارِ حق، مرد خدا کا یقین
اور یہ عالم تمام وہم و طلسم و مجاز

پرکار = دائرہ۔ نقطہ، پرکار۔ دائرہ کا مرکزی نقطہ۔ نقطہء پرکارِ حق = یہاں حق کو دائرہ سے تشبیھ دی گئی ہے۔ گویا حق کا مرکز۔ مردِ خدا = مومن۔ یقین = مراد اللہ پر یقین۔

مطلب: جس طرح نقطہ دائرہ کا مرکز ہوتا ہے۔ یعنی اگر نقطہ نہ ہو تو دائرہ نہیں بن سکتا گویا دائرہ

کا انحصار اس نقطہ پر ہوتا ہے جس کو مرکز قائم کر کے دائرہ بنایا جاتا ہے اسی طرح مومن کے عقائد و اعمال کا انحصار یقین کامل پر ہوتا ہے۔ اسی کیساتھ مومن یہ بھی سمجھتا ہے کہ دنیا وہم کے مانند ہے یا جادو کی طرح ناپائیدار اور محض فریب ہے۔ (اور حقیقی یعنی باقی رہنے والی زندگی آخرت میں ملے گی)۔

(۴۰) عقل کی منزل ہے، وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقہء آفاق میں گرمیِ محفل ہے وہ

اس شعر میں۔ ''وہ'' کا اشارہ یقین کے لئے استعمال ہوا ہے۔

مطلب: مومن کے لئے عقل کی منزل بھی یقین ہے۔ یعنی عقل بھی یہی کہتی ہے کہ یقین حاصل کیا جائے۔ اور یقین ہی عشقِ الٰہی کا مقصود ہے۔ یعنی عشق بھی یقین ہی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سارے عالم میں تمام رونق اور گہما گہمی یقین کی بدولت ہے۔ یہاں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ یوں تو عقل و عشق ایک دوسرے کی ضد مانے جاتے ہیں۔ مثلاً خود اقبال نے کہا ہے:

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق عقل ہے محو تماشائے لبِ بام ابھی

لیکن زیر نظر شعر میں اقبال نے عقل و عشق دونوں کی منزل ایک ہی قرار دے دی ہے۔ یہ

شاعرانہ کمال کا نمونہ ہے۔

(۴۱) کعبہء ارباب فنِ سطوتِ دینِ مبین
تجھ سے حرم مرتبت اندلسیوں کی زمیں

کعبہ = مراد مرکز جس طرح سخانہء کعبہ مسلمانوں کا مرکزِ عبادت ہے۔ ارباب ِفن = فن جاننے والے۔ یہاں فن سے مراد فن تعمیر ہے۔ سطوت = شان وشوکت
دین مبین = مراد اسلام۔ (اسلام کو دین مبین یعنی کھلا ہوا دین اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس کے عقائد واعمال سب صاف صاف کھلے ہوئے ہیں۔ اس کی آسمانی کتاب یعنی قرآن کسی تبدیلی یا کاٹ چھانٹ کے بغیر پورے کا پورا سامنے موجود ہے۔ اسکے رسول اعظم محمد بن عبداللہ ﷺ کی ساری زندگی خانگی اور سماجی دونوں بلاحجاب اور پوشیدگی کے سب کے سامنے ہے۔ حرم مرتبت = مرتبہ میں خانہء کعبہ کے مانند۔
مطلب: اب پھر شاعر مسجد قرطبہ کو مخاطب کرتا ہے۔ کہتا ہے: اے فن تعمیر کی خوبیوں سے واقف افراد کی نظر میں کعبہ کی مانند قابل احترام ہستی۔ اور اے اسلام ایسے صاف دین کی شان شوکت۔ تیری بدولت اسپین کی سرزمین مرتبہ میں کعبہ کے ہم پلّہ ہوگئی۔

(۴۲) ہے تہ گردوں اگر حُسن میں تیری نظیر
قلبِ مسلماں میں ہے اور نہیں ہے کہیں !

تہ گردوں = زیر آسمان یعنی اس دنیا میں۔ نظیر = مثال

مطلب: (اے مسجد قُرطبہ) تو اس قدر حَسین ہے کہ تیری مثال مسلمان کے دل کے سوا دنیا میں کہیں اور نہیں ہے۔

(۴۳) آہ وہ مردانِ حق ! وہ عربی شہسوار
حاملِ "خلقِ عظیم"، صاحبِ صدق ویقیں

مردان حق: دیندار افراد۔ حامل خلق عظیم = بلند مرتبہ عادتوں والے۔ قرآن میں رسولِ خدا ﷺ کے بارے میں اللہ کا ارشاد ہے: وانک لعلی خلق عظیم (اے رسول ﷺ آپ یقیناً بلند مرتبہ عادتوں پر) ۔سورہ نمبر ۶۸ القلم آیت نمبر ۴۔ صاحبِ صدق و یقین = دیندار اور یقین رکھنے والے۔

مطلب: اب شاعران مسلمانوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جنہوں نے اسپین میں فاتحانہ داخل ہو کر اسلامی حکومت قائم کی لیکن چونکہ اب وہاں اسلامی حکومت نہیں رہی اس لئے شاعران لوگوں کو حسرت سے یاد کرتا ہے۔ کہتا ہے۔ ہائے وہ دیندار، حق پرست، اور یقین کامل رکھنے

والے اور بلند اخلاق عرب فاتح۔

(۴۴) جن کی حکومت سے ہے فاش یہ رمزِ غریب
سلطنتِ اہل دل فقر ہے ،شاہی نہیں

فاش = ظاہر، آشکار۔ رمز = بھید۔ غریب = تعجب خیز۔ فقر = مراد سادہ زندگی جو ظاہری شان وشوکت سے بری ہو۔ اہل دل = عشق الٰہی رکھنے والے۔ مطلب: یہ شعر پیشرو شعر سے مربوط ہے۔ یعنی وہ مردان حق جن کا ذکر اس پہلے کیا گیا ان کے طرز زندگی سے یہ تعجب خیز راز ظاہر ہوا کہ جو والیان ملک ایمان اور اللہ پر یقین رکھتے ہوں وہ شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ کی زندگی کے بجائے فقیروں جیسی سادہ زندگی بسر کرتے ہیں۔

(۴۵) جن کی نگاہوں نے کی تربیتِ شرق و غرب
ظلمتِ یورپ میں تھی جن کی خرد راہ بیں

شرق وغرب = مشرق ومغرب۔ ظلمت = تاریکی۔ ظلمتِ یورپ = وہ حالت جب یورپ پر جہالت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ خرد = عقل۔ راہ بیں = راستہ دکھانے والی۔

مطلب : یہ شعر بھی پہلے دونوں شعروں سے مربوط ہے یعنی اسپین کے عرب (مسلمان) حکمرانوں کا ذکر چل رہا ہے۔شاعر کہتا ہے کہ ان مسلمانوں نے مشرق و مغرب دونوں طرف کے ممالک میں ترقی پھیلائی۔اور ان کی عقلوں نے یورپ کی اس حالت میں راہبری کی جب وہ (جہالت کی) تاریکی میں پڑا ہوا تھا۔

(۴۶) جن کے لہو کی طفیل آج بھی ہیں اندلسی
خوش دل وگرم اختلاط سادہ و روشن جبیں

طفیل = زیر اثر۔ اندلسی = اسپین کے باشندے۔(عرب لوگ اسپین کو اندلسی کہتے ہیں)۔
خوش دل = خوش مزاج، ہنس مکھ۔
گرم اختلاط = گرمجوشی سے ملنے والے، ملنسار۔روشن جبیں۔روشن پیشانی والے، ہنس مکھ

مطلب: یہ انہی عربوں کے خون کا اثر ہے کہ اب بھی (جبکہ اسپین میں مسلمانوں کی حکومت نہیں رہی) اسپین کے باشندے خوش مزاج، ملنسار اور ہنس مکھ ہوتے ہیں

(۴۷) آج بھی اس دیس میں عام ہے چشمِ غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

غزال = ہرن (مشہور چوپایہ) جس کی آنکھ کی خوبصورتی مشہور ہے۔ دل نشین = دل پر خشگوار اثر کرنے والا۔

مطلب: آج بھی اسپینی باشندوں میں ہرن کی سی خوبصورت آنکھیں عام طور پر پائی جاتی ہیں اور انکی نگاہیں دل کے لئے نہایت پُر اثر ہوتی ہیں۔

(۴۸) بوے یمن آج بھی اس کی ہواؤں میں ہے!
رنگِ حجاز آج بھی اس کی نواؤں میں ہے!

بوئے یمن = مراد اسلام کی بو۔ رنگِ حجاز = مراد اسلام کا رنگ۔ نوا = آواز مراد بولی یا زبان۔

مطلب: آج بھی اسپین کی ہواؤں میں اسلام کی بو پائی جاتی ہے گویا اسکی تہذیب میں اسلام کی جھلک ملتی ہے۔اور اسی طرح یہاں کی بولی میں اسلامی طرز پایا جاتا ہے

(۴۹) دیدۂ انجم میں ہے تیری زمین ، آسماں
آہ! کہ صدیوں سے ہے تیری فضا بے اذاں

دیدہ = آنکھ انجم = نجم کی جمع معنی ستارہ آسماں= گویا آسمان کی مانند بلند = مراد بلند مرتبہ (خیال رہے کہ مرتبہ کی بڑائی کو بلندی سے اور کم مرتبہ پستی سے نسبت دے کر بیان کیا جاتا ہے چونکہ آسمان نہایت بلند ہے اس لئے مرتبہ کی انتہائی بلندی کو آسمان سے نسبت دے کر بیان کرتے ہیں)۔

مطلب: اب پھر شاعر مسجدِ قرطبہ سے خطاب کرتا ہے کہتا ہے کہ اے مسجدِ قرطبہ ستاروں کی نگاہ میں تیری زمیں کا مرتبہ آسمان کی مانند بلند ہے لیکن افسوس کہ صدیوں سے تجھ میں اذان نہیں دی جاسکی۔ (کیونکہ اسپین سے مسلمانوں کو پوری طرح نکالا جاچکا ہے)۔

(۵۰) کون سی وادی میں ہے کون سی منزل میں ہے
عشق بلاخیز کا قافلہ سخت جاں

عشقِ بلاخیز = مراد اسلام۔ اسلام کو عشق اس لئے کہا گیا ہے کہ اس میں عشقِ الٰہی یعنی اللہ سے محبت کرنے پر خاصا زور دیا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے: قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ (اے رسول کہہ دیجئے اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو)

سورہ ۳ آل عمران آیت ۲۹ گویا یہ آیت بتا رہی ہے کہ اللہ سے محبت کرنا ہر مسلمان کا شعار ہونا چاہیے ۔اسلام کو بلاخیز ظاہراً اس لئے کہا کہ تحریکِ اسلام نے اپنے ابتدائی دور ہی میں (یعنی نصف صدی کے اندر ہی اندر) اس زمانے کی بڑی بڑی اور کئی قدیم تہذیبوں مثلاً ایرانی تہذیب ، بزنطینی تہذیب وغیرہ کو بلکہ خود عرب میں جاہلیت کے دور کی قبائلی زندگی کے طور طریقے مٹا کر اپنا سکہ جما لیا تھا۔

سخت جان= جس کو مار ڈالنا یا فنا کرنا بہت مشکل ہوتا ہوا اسلام ظاہراً ان معنوں میں سخت جان ہے کہ دوسری تہذیبوں سے نہایت سخت مقابلوں میں بھی اسلام بالآخر کامیاب ہو کر زندہ رہا۔

مطلب :اس سے پہلے کے شعر میں شاعر نے مسجدِ قرطبہ کی ویرانی کا یہ کہہ کر اشارتاً ذکر کیا ہے کہ اب اس مسجد میں اذان نہیں ہوتی (حالانکہ مسجد ہوتی ہی اذان اور نماز کے لئے ہے) اس طرح شاعر کا خیال فطرتاً اس طرف متوجہ ہوتا ہے کہ اسپین مسلمانوں سے یکسر خالی ہو چکا ہے ۔چنانچہ اب حیران اور رنجیدہ ہو کر اپنے ذہن سے سوال کرتا ہے کہ وہ اسلام (جو کسی وقت بلاخیزی سے اٹھ کر قلیل عرصہ میں اُس زمانہ کی قریب قریب پوری مہذّب دنیا پر چھا گیا تھا) اب کہاں اور کس حالت میں ہے۔

(۵۱) دیکھ چکا المنیٔ شورشِ اصلاحِ دیں

جس نے چھوڑے کہیں نقش کہن کے نشاں

المنی = ملک جرمنی۔ شورشِ اصلاح دیں = اس تحریک کو کہا سے جو یورپی تارریخ میں Reformation (اصلاح) کے نام سے مشہور ہے۔ اس تحریک کو ایک شخص مارٹن لوتھر (Martin Luther) متوفی ۱۵۴۶ء نے جرمنی سے شروع کیا تھا۔ اس کا اولین مقصد یورپ میں اس وقت کے رائج مذہب یعنی عیسائیت کو پوپ (پاپائے اعظم کی بالادستی سے آزاد کرانا تھا۔ چنانچہ اس تحریک کے زیر اثر پروٹیٹنٹ (Protestant) عقائد کی بنیاد پڑی اور بالآخر عیسائی مذہب کے ہر ہر ملک میں پروٹیٹنٹ عسائیت کی الگ الگ ملکی تنظیمیں قائم کرلی گئیں جو پوپ کی بالادستی یعنی کیتھولک عیسائیت سے آزاد رہیں۔ نقش کہن = پرانا نظام مراد عیسائی مذہب کا وہ نظام جس میں پوپ کی بلادستی قائم تھی۔

مطلب: اب شاعر کی نظر میں اس وقت کی یورپی تہذیب کے تمام انقلابات آنے ہیں اور وہ ان میں سے خاص خاص واقعات کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس شعر میں تحریک اصلاح دین Reformation کے متعلق کہتا ہے کہ جرمنی میں اصلاح دین کی تحریک نے عیسائی مذہب کے پرانے نظام کو (جس میں پوپ پوری عیسائیت کا بلاشرکت غیرے سربراہِ اعظم مانا جاتا تھا) فنا کردیا۔

(٥٢) حرفِ غلط بن گئی عصمت پیرِ کنشت
اور ہوئی فکر کی کشتیِ نازک رواں

حرفِ غلط بن گئی = اس طرح مٹ گئی جیسے حرفِ غلط کو مٹایا جاتا ہے۔عصمت = بے گناہی مرادنا قابلِ اعتراض حیثیت۔پیرِ کنشت = یعنی پوپ مطلب: یہ شعر پہلے شعر سے مربوط ہے۔یعنی تحریک اصلاح دین ہی کے نتیجہ میں یہ عقیدہ بھی ختم ہو گیا کہ پوپ اعتراض وتردید سے بالاتر ہے یعنی ان کے کسی حکم یا فعل پر حرف نہیں لایا جا سکتا ہے۔ بلکہ اب معاملات پر آزادی سے عقل کی روشنی میں سوچا جانے لگا۔

(٥٣) چشم فرانسیس بھی دیکھ چکی انقلاب
جس سے دگرگوں ہوا آفریوں کا جہاں

فرانسیس = ملکِ فرانس۔ انقلاب = یعنی ۱۷۸۹ء کا انقلاب فرانس French Revolution جس سے وہاں بادشاہت ختم ہو کر جمہوری حکومت کی بنیاد پڑی۔اور اس کے اثر سے رفتہ رفتہ سارے یورپ میں مطلق العنان بادشاہتوں کا زوال اور جمہوری نظام کا قیام عمل میں آ گیا۔

دگرگوں ہوا = متغیر ہوا۔بگڑ گیا۔اُلٹ پلٹ ہو گیا۔مطلب: اور فرانس میں وہ عظیم انقلاب برپا

ہو گیا جس کے پھیلتے ہوئے اثر سے تمام مغربی ممالک یعنی یورپ اور امریکہ کی سیاسی دنیا میں بڑی بڑی تبدیلیاں واقع ہو گئیں یعنی باشاہتوں کا زوال اور جمہوری نظاموں کا قیام عمل میں آ گیا۔

(۵۴) ملتِ رومی نژاد کہنہ پرستی سے پیر
لذتِ تجدید سے وہ بھی ہوئی پھر جواں

ملتِ رومی نژاد = مراد قدیم رومی تہذیب (انگریزی میں) جو اپنے بلا دست مذہبی نظام اصولی حکمرانی، قانون پسندی وغیرہ کے لحاظ سے صدیوں تک مہذب دنیا کے لئے نمونہ بنی رہی۔ لذتِ تجدید = ترقی کی نئی لہر جو یورپی ادب میں (Renaissance) یعنی نشاۃ ثانیہ کے نام سے مشہور ہے۔ کہنہ پرستی = پرانے طور طریقوں پر قائم رہنے کا جذبہ مطلب: رومی تہذیب بھی جس کے طور طریقے اور اصول و غیرہ اب پرانے ہو گئے تھے یورپ میں پھیلتی ہوئی ترقی کی نئی لہر سے متاثر ہو کر پھر سے چمک اٹھی۔

(۵۵) روحِ مسلماں میں ہے آج وہی اضطراب
راز خدائی ہے یہ کہہ نہیں سکتی زباں!

اضطراب= تڑپ، مراد ترقی کرنے کی خواہش۔ مطلب: آج کا مسلمان بھی (ترقی کی اس لہر سے فائدہ اٹھانے کے لئے) اسی طرح تڑپ رہا ہے لیکن (کیوں مسلمان اس دوڑ میں شریک نہیں ہوسکا) یہ ایک راز ہے جس کا بیان کرنا مناسب نہیں ہے۔

(۵۶) دیکھیے اس بحر کی تہ سے اچھلتا ہے کیا
گنبدِ نیلو فری رنگ بدلتا ہے کیا!

بحر= سمندر گنبد نیلوفری= نیلا آسمان رنگ بدلنا= انقلاب لانا۔ (اردو ادب میں زمانہ کی حالت بدلنے کو زمانہ قدیم سے آسمان کا رنگ بدلنا کہا جاتا رہا ہے۔ ہماری زبان کے قدیم شاعر حیدر علی آتش کا شعر ہے:

زمینِ چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا۔ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

مطلب: اس شعر میں سمندر سے اشارہ ہے اس سے پہلے شعر میں بیان کی ہوئی 'روح مسلماں کی طرف جس کو یہاں سمندر سے تشبیہ دی گئی ہے۔ شاعر کو اب انتظار ہے کہ مسلمان کی روح کی اس موجودہ بے چینی کے نتیجہ میں کیا انقلاب سامنے آتا ہے۔

(۵۷) وادیٔ کہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب!

کہسار = پہاڑ۔ شفق = آفتاب کے غروب ہوتے وقت آسمان پر مغرب کی سمت چھائی ہوئی سرخی ۔غرقِ شفق = شفق میں ڈوبا ہوا۔لعل = یاقوت سرخ جو ایک مشہور قیمتی پتھر ہے۔ بدخشاں = وسطی ایشیا کا ایک قدیم شہر جو اب روس کی جمہوریہ تاجکستان Tadzik S.S.R. میں شامل ہے۔ یہ قدیم زمانہ سے اپنے سرخ یاقوتوں کے لئے مشہور ہے۔

مطلب: ظاہری الفاظ سے تو یہ شعر شام کا منظر پیش کر رہا ہے جب کہ ڈوبتے ہوئے سورج کے باعث آسمان پر مغرب کی سمت بادلوں پر اس طرح شفق پھیلی ہوتی ہے جیسے آفتاب جاتے جاتے بدخشانی یاقوتوں کا ایک ڈھیر چھوڑ گیا ہو۔لیکن مراد اس سے یہ ہے کہ گو اس وقت دنیائے اسلام پر تاریکی کے بادل چھائے ہوئے ہیں مگر اسلام کی گزری ہوئی عظمت وشوکت کا آفتاب جاتے جاتے ایسی شفق چھوڑ گیا ہے جو اسکی سنہری تاریخ بیان کر رہی ہے۔

(۵۸) سادہ و پر سوز ہے دخترِ دہقاں کا گیت
کشتیٔ دل کے لیے سیل ہے عہدِ شباب!

پرسوز = غمناک ۔رنج دینے والی۔ دختر = لڑکی دہقان = کِسان سیل = پانی کا بہاؤ۔

عہد شباب = جوانی کا زمانہ۔

مطلب: اس شعر کے بھی ایک ظاہری معنی ہیں اور ایک گہرے معنی ہیں۔ لفظی لحاظ سے اس کے یہ معنی ہیں کہ کسان کی لڑکی کا گیت (جو وہ کام کرتے ہوئے گاتی رہتی ہے) سادہ اور غم میں ڈوبا ہوا ہے اور اسکی جوانی کے فطری جوش اور جذبات کا اظہار ہے۔ لیکن اس شعر کا درونِ پردہ مفہوم سمجھنے کے لئے یہ ذہن نشین رکھنا ہوگا کہ شاعر کے زمانہ میں پورے ہندوستان میں (جس میں وہ علاقہ بھی شامل تھا جو اب پاکستان ہے) کسانوں کی مالی اور اقتصادی حالت بہت خراب تھی۔ اور ہر چہار طرف سے کسانوں کی بدحالی کے متعلق آوازیں بلند ہو رہی تھیں ۔اس چیخ وپکار کی مثال ایسی ہی تھی جیسے دہقانی لڑکی کا گیت۔ یعنی وہ گیت عہد جوانی کی فطری اُپج کا نتیجہ تھا اور یہ چیخ وپکار ناقابل برداشت بدحالی کا نوحہ تھی۔

(۵۹) آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کا خواب

آبِ رواں = دریا کبیر = اسپین کا دریائے وادی الکبیر ۔ (انگریزی میں Guadalquivir)۔ کوئی = شاعر نے اپنے آپ کو کہا ہے۔ کسی اور زمانہ کا خواب = اسلام کی پچھلی عظمت کو دوبارہ حاصل کرنے کا خواب یعنی تمنا۔ مطلب: شاعر دریائے وادی الکبیر

کے کنار کھڑے ہو کر دریا سے کہہ رہا ہے کہ اے دریا میں یہاں تیرے کنارے کھڑے ہوئے مستقبل کا وہ زمانہ دیکھ رہا ہوں جب اسلام پھر وہی عظمت حاصل کر لے گا جو اس کو اس سر زمین پر حاصل تھی۔

(٦٠) عالم نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اسکی سحر بے حجاب

عالم نو = نیا زمانہ۔ مراد وہ زمانہ جب اسلام پھر سے عظمت وشوکت حاصل کر لے گا۔ پردۂ تقدیر = اللہ کا اردہ جو غیر معلوم ہے۔ سحر = صبح بے حجاب = ظاہر

مطلب: یوں تو وہ زمانہ جب اسلام اپنی عظمتِ رفتہ کو حاصل کر سکے گا صرف اللہ ہی کے علم میں ہے لیکن مجھ کو موجودہ تاریکی کے بعد آنے والی روشن صبح صاف نظر آ رہی ہے۔ یعنی مسلمانوں کا مستقبل شاندار اور تابناک ہے۔

(۶۱) پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے

لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

افکار=فکر کی جمع معنی خیالات۔ فرنگ=انگریز نوا= آواز گویا باتیں۔

تاب لانا= برداشت کرنا۔

مطلب: اگر میں اپنے وہ انقلابی خیالات (جو ہندوستانی مسلمانوں کے آئندہ طریق کار کے متعلق میرے ذہن میں ہیں) ظاہر کردؤں تو انگریز (جو ہندوستان پر قابض ہیں اور یہاں کے مسلمانوں کو بھی اپنے پنجہ میں دبائے ہوئے ہیں) میری باتوں کو برداشت نہ کرسکیں گے۔

(۶۲) جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی

روح امم کی حیات کشمکشِ انقلاب!

انقلاب= حالات کو تبدیل کردینے والا عمل۔ امم = امت کی جمع معنی قوم۔

کشمکش = کھینچا تانی طرح طرح کی عملی کوششیں۔

مطلب: شاعر مسلمانوں کو انقلاب کی طرف مائل کرنے کے لئے ان کو سمجھا رہا ہے کہ ایک ہی حالت پر قائم رہنا اور حالات کو بدلنے کی کوشش نہ کرنا زندگی نہیں بلکہ موت کے مانند ہے۔ یعنی اصل زندگی یہ ہے کہ انسان پیہم حالات میں اصلاح کی کوشش میں لگا رہے۔ کیونکہ

قوموں کی صحیح زندگی انقلاب میں ہوتی ہے۔

(۶۳) صورت شمشیر ہے دستِ قضا میں وہ قوم
کرتی ہے جو ہر زماں اپنے عمل کا حساب!

صورت شمشیر=تلوار کی مانند۔ دستِ قضا=یعنی خدا کا حکم (جو کبھی ٹلتا نہیں)۔
عمل کا حساب کرنا=یعنی نتیجہ کے لحاظ سے عمل کی کامیابی اور ناکامی کو جانچتے رہنا۔
مطلب: اس قوم کی مثال جو اپنے اعمال کی کامیابی اور ناکامی کو نتیجہ کے لحاظ سے برابر جانچتی رہے ایسی ہے گویا وہ خدا کے ہاتھ میں فیصلہ کرنے والی تلوار ہے۔ یعنی وہ اپنے عمل سے اپنے مقاصد حاصل کریگی جیسے وہ خدائی فیصلے ہوں جو ضرور پورے ہوتے ہیں۔

(۶۴) نقش ہیں سب ناتمام خونِ جگر کے بغیر
نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر!

نقش=تصویر کا خاکہ۔ خونِ جگر=سخت محنت۔ سودائے خام=نرِا پاگل پن
مطلب: خاکہ میں رنگ بھرے بغیر تصویر پوری نہیں بنتی۔ اسی طرح سخت محنت اور مشق کئے بغیر گانا نرا پاگل پن معلوم ہوتا ہے۔ شاعر نے یہ دو مثالیں یہ سمجھانے کے لئے دی ہیں کہ کوئی منصوبہ عمل کئے بغیر کامیاب نہیں ہوتا۔